

# اسلام کے تاریخی ارتقاء کی نوعیت

عبدالحمید صدیقی

(۲)

اسلام کا دوسرا امتیازی وصف جس نے اس کے ارتقاء کا ایک خاص انداز اور رخ متعین کیا وہ عقیدہ ختم نبوت ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے چونکہ وحی اور الہام کا سلسلہ نبی آخر الزمان پر ختم ہو چکا ہے اس لیے کوئی شخص بھی اب اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی کسی بات کو الہامی سمجھ کر بلا چون چرا قبول کر لیا جائے۔ کوئی صوفی، کوئی عالم اور کوئی حاکم بطور عقیدہ غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ حافظ ابن قیمؒ نے اپنی مشہور تصنیف اعلام الموقعین میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور قرآن و سنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے ہٹ کر اگر کوئی شخص کسی چیز کی پیروی کرتا ہے تو وہ گمراہی ہے۔ یہاں ہم حافظ صاحب کی تصریحات کی تینیں پیش کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے ایک نہیں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو بڑی وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے کہ حق و صداقت کی راہ وہی ہے جس کی باری تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ شاندر ہی کر دی ہے اور جس پر حضور سرور و دو عالم نے خود چل کر اس کے نشیب و فراز سے پوری انسانیت کو آگاہ فرما دیا ہے۔

۱۔ ہماری ساری بحث حافظؒ کی کتاب سے ماخوذ ہے جو حضرات اسے تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہوں وہ اعلام الموقعین جلد اول کی فصل "فی تحمیم الاقدام فی دین اللہ بالرأی المتضمن للمخالفة النصوح والرأی الذی لم تشهد له النصوح بالقبول" کی طرف رجوع کریں۔

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ  
وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ

(الاعراف - ۲)

لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر  
نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے  
رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی  
نہ کرو۔

اس آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ ہدایت و رہنمائی کا واحد سرچشمہ وہ تعلیم  
ہے جو نبی نوع انسان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہے۔ اس ایک منبع کے سوا کسی دوسرے  
منبع سے افکار و اعمال کے جو دھارے نہ بنی سکتیں ان کی پاکیزگی کے بارے میں کوئی بات بھی یقین اور  
وثوق کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ یہ اُس سرچشمہ سے رواں نہیں ہوتے جو ہر لحاظ سے مامون و  
محفوظ ہو۔ وہ علم جن کا ماخذ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت نہیں، اس میں باطل  
کی آمیزش کے سارے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر بڑی تاکید کے  
ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ  
فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ  
وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ  
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

(انساء: ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور  
اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں  
سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان  
کسی معاملہ میں نزاع ہو جہاں تو اسے اللہ اور  
رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور  
روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح تفسیر کا  
ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتری ہے۔

اس آیت کی جو تشریح حافظ ابن قیم نے کی ہے ہم یہاں اُس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

”اطِيعُوا کے لفظ کو جس طرح باری تعالیٰ نے اپنے لیے ارشاد فرمایا ہے اسی

طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں

ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ کی اطاعت باری تعالیٰ کی اطاعت کی طرح مستقلاً واجب ہے لیکن اولوالامر کے بارے میں اطیعوا کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اولوالامر کی اطاعت مستقلاً واجب نہیں بلکہ رسول کی اطاعت کے تابع ہے۔ یعنی صاحب امر جو حکم حضور سرورِ دو عالم کی متابعت میں دے اسے بسر و چشم تسلیم کیا جائے اور جو حضور کی لائی ہوئی تعلیمات سے بے نیاز ہو کر دیا جائے اُسے ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ حضور نے خود اس ضمن میں نہایت واضح طور پر فرمایا ہے لاطاعة لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ کسی مخلوق کی اطاعت خالق کی نافرمانی میں نہیں۔ بعض دوسرے مقامات پر یوں ارشاد فرمایا: "انما الطاعة فی المعروف" اطاعت صرف معروف میں ہے، "فمن امرکم منکم بمعصیۃ اللہ فلا سمع لہ ولا طاعة" "اے صحابہ! امر میں سے جو کوئی تمہیں اللہ کی نافرمانی کا حکم دے تو اس کے معاملے میں نہ سمع ہے اور نہ اطاعت، اس ضمن میں حضور سرور کائنات کی وہ حدیث قابلِ غور ہے جس میں حضور نے ان لوگوں کے حق میں جو اولی الامر کے حکم کی تعمیل میں آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو گئے تھے فرمایا کہ اگر یہ اُس میں کود پڑتے تو ہمیشہ آگ ہی میں رہتے۔ یہ اس بات کا تین ثبوت ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کے علاوہ کسی دوسرے کی غیر مشروط اطاعت جائز نہیں۔ پھر قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو" اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ امت کے مختلف افراد کے مابین نیک نیتی کے ساتھ اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ اختلاف انہیں دائرۃ ایمان سے خارج نہیں کرتا۔

فان تنازعتم فی شئیء فی اللہ ورسولہ فاعلموا ان اللہ ورسولہ احق بالاتباع ان یتخلفوا  
 فان تنازعتم فی شئیء فی شئیء من غیرہ فاعلموا ان ان یتخلفوا  
 فان تنازعتم فی شئیء من غیرہ فاعلموا ان ان یتخلفوا  
 فان تنازعتم فی شئیء من غیرہ فاعلموا ان ان یتخلفوا

میں آخری فیصلے کے لیے ایک صاحبِ ایمان اللہ اور اُس کے رسول کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی کتاب کو حکم مانا جائے اور اُس کے رسول کی طرف رجوع کرنے سے مراد آپ کی حیاتِ طیبہ میں تو آپ کی ذاتِ گرامی کی طرف رجوع کرنا ہے اور آپ کے بعد آپ کی سنت سے سندِ صداقت حاصل کرنا ہے۔“

حافظ ابن قیم نے محولہ بالا آیت کی تصریح میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ اولوالامرا اور عام افراد امت کے مابین اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ اختلاف اگر نیک نیتی پر مبنی ہو تو کسی لحاظ سے بھی قابلِ مذمت نہیں۔ چونکہ ہر شخص کے سوچنے سمجھنے کا انداز اور صلاحیت ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ سارے افراد کا زندگی کے ہر معاملے میں ایک ہی نقطہ نگاہ ہو۔ قرآن مجید نے اس اختلاف کو دور کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ جن حضرات کے درمیان اختلاف رونما ہو جائے وہ آخری فیصلے کے لیے کتاب و سنت کی عداوت میں اپیل کریں کیونکہ یہ وہ سب سے اونچی عدالت ہے جہاں سے انہیں بالکل بے لاگ فیصلہ مل سکتا ہے۔ مفسرینِ کرام نے اسی آیت سے اُن لوگوں کے نظریہ کی بھی تردید کی ہے جو رسولِ معصوم کے علاوہ مستقل ائمہِ عصمیین کا بھی وجود تسلیم کرتے ہیں۔ ہر امام، ہر صاحبِ علم، ہر مفسر و محدث، ہر مسلح اور معونی اپنی ساری بزرگیوں کے باوجود بہر حال غیر معصوم ہی ہے اس لیے ان میں سے کسی کی بھی غیر مشروط اطاعت جائز نہیں۔ اطاعت اور فرمانبرداری صرف معروف ہی میں صحیح اور درست ہے۔

اسلام کے اس بنیادی تصور نے مسلمانوں کے فکری اور عملی ارتقاء کا ایک ایسا رخ متعین کیا ہے جو دوسری اقوام سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ انسان نے اصحابِ عقل پر بڑی تند و مد سے تنقید کی، اُن کی آرا سے اختلاف کیا اور جس معاملے میں انہیں کوئی لغزش محسوس ہوئی اس کا برملا اظہار کیا اور اس سارے کام کو پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ

سرا انجام دیا لیکن اصحاب کشف کی ہر بات کو کلام الہی سمجھ کر فوراً قبول کیا اور ان کے مکاشفات کو وہی اہمیت اور فیصلہ کن حیثیت دی جو اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت کو دی جاتی ہے۔ ہم یہاں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ایک صاحب عقل کی عقلی تصریحات یا وہ صحیح ہوتی ہیں یا کسی صاحب کشف کے مکاشفات۔ عقل کی افادیت اپنی جگہ مسلم، مگر مذہبی بیخبر اس بات کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ عقل اپنی ساری کامرانیوں کے باوجود تنہا انسان کی رہنما نہیں بن سکتی۔ یہ انسان کی دوسری صلاحیتوں کی طرح محدود ہے۔ اس پر انسان کے ذاتی رجحانات اُس کے احساسات اور مفادات کی پرچھائیاں برابر پڑتی رہتی ہیں۔ اس لیے اس کے نیشوں میں وہ بے لوثی اور انصاف پیدا نہیں ہو سکتا جو کسی صحیح نظام اخلاق کے لیے ضروری ہے۔ عقل کے پڑوں کو جذبات، تعصبات، زمان و مکان کے اثرات برابر متاثر کرتے رہتے ہیں اس لیے عقل جب تک وحی و الہام کی روشنی میں آگے نہیں بڑھتی اس وقت تک منزل مقصود حاصل نہیں کر سکتی اور اگر وہ اس روشنی کے بغیر خود آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو وہ تاریکیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے اور بسا اوقات پھسل کر نہایت خوفناک اور مہیب غاروں میں جا گرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے اندر وحی و الہام کو ہمیشہ فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی ہے اور عقل کی ساری تصریحات اور توجیہات کی تدریجیت کا اندازہ وحی کی میزان پر تول کر کیا جاتا ہے۔ عقل کے معاملے میں اسلام اور دوسرے مذاہب کا نقطہ نظر قریب قریب ایک ہے لیکن اصحاب باطن کے مکاشفات کے بارے میں اسلام، دوسرے مذاہب سے تمیز و ممتاز ہے۔ چونکہ نبوت کا سلسلہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا ہے اس لیے ایک مسلمان از روئے عقیدہ کسی چیز کو بھی کتاب اللہ اور سنت رسول کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول نہیں کر سکتا۔ وہ اصحاب کشف کے باطنی مشاہدات خواہ وہ اُن کے لیے کتنی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوں اسی صورت میں قبول کرے گا جیسے اللہ اور اُس کے رسول کی تعلیمات کے عین مطابق ہوں۔ اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے اصحاب خرد اور اصحاب کشف کو ایک ہی مقام پر لا کر کھڑا کیا ہے۔ وہ ان دونوں کے تجربات

سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کے تجربے اور مشاہدے کو وحی اور الہام کی روشنی میں پوری طرح پرکھ کر قبول کرتا ہے۔ ان میں سے جو چیز وہ دینِ حق کے مطابق پاتا ہے اُس کی پذیرائی کرتا ہے۔

اللہ کی کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو خود اصحابِ کشف نے بھی فیصلہ کن حیثیت دی ہے اور انہوں نے مسلمانوں کو بار بار اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ اُن کے کسی قول یا فعل کو جب تک وہ اُسے اللہ اور اُس کے رسول کے بتلائے ہوئے معیار پر پوری طرح پرکھ نہ لیں، قبول نہ کریں کیونکہ اُن کے مشاہدات خواہ کتنے صحیح ہوں لیکن وحی و الہام کی طرح سو فیصد لغزش سے محفوظ و مامون نہیں ہو سکتے۔ ان مشاہدات میں بھی انسانی تجربات اور عقلی تصریحات کی طرح مشاہدے کرنے والے کے ذاتی رجحانات اور میلانات اپنا رنگ بھر دیتے ہیں۔ انسان کی محدود صلاحیتوں کے اثرات خواہ وہ عقل کا میدان ہو یا کشف اور مجاہدہ باطن کا، ہر جگہ ظاہر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے صوفیا جنہیں ائمہ تصوف کہنا چاہیے انہوں نے بھی اس امر کا پوری طرح اعتراف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ معیارِ حق صرف تعلیماتِ الہی اور سنتِ رسول ہے اور اسی کے مطابق ہر تجربے اور مشاہدے کی قدر متعین کرنی چاہیے۔ مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح فرمائی ہے۔ مجدد صاحب کے علاوہ شیخ علی بن عثمان ہجویری نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں شیخ عبدالقادر جیلانی نے فتوح الغیب میں شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں اور اسی طرح کے دوسرے بزرگوں نے بلا استثناء اپنے مشاہدات پر شریعت کی بالادستی کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ مسلمان جب اجتماعی طور پر کوئی کام کرتے ہیں جس میں ایک شخص

۱۰ ص ۲۴، ۲۵-۵۱

۱۱ ص ۱-۱۴

۱۲ ص ۲۳-۲۶

کی امامت یا قیادت ناگزیر ہوتی ہے تو وہ اس فرض کو انجام دینے سے پہلے اس حقیقت کو خود بھی ذہن میں لاتا ہے اور دوسروں کو بھی پورے مجمعے کے سامنے یاد دلاتا ہے کہ حق و صداقت کا حقیقی صرف اللہ اور اُس کے رسول ہیں۔ اُن کی اطاعت اور فرمانبرداری ہی میں اُس کی دنیاوی فلاح اور اخروی نجات کا راز مضمون ہے۔ جمعہ سے بڑھ کر مذہبی اور روحانی اجتماع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس میں امام سب سے پہلے اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ حق و صداقت کی راہ صرف وہی ہے جو اللہ اور اُس کے رسول نے بتائی ہے :

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ  
فَقَدْ رَشِدَ وَمَنْ يَعْصِهَا فَأِنَّهُ لَا  
يُضِلُّ إِلَّا نَفْسَهُ وَلَا يُضِلُّ اللَّهُ  
شَيْئًا -

جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے  
اُس نے ہدایت پائی اور جو ان کی نافرمانی کرے  
وہ اپنی جان کو ہی نقصان دیتا ہے اور اللہ  
تعالیٰ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

خلافت ایک ایسا ادارہ ہے جو امور دنیا اور امور دین دونوں پر حاوی ہے اور اس کا سربراہ مملکت ریاست کے ہر شعبہ زندگی کا براہ راست ذمہ دار ہونا چاہئے تاکہ تعلق اخلاق و روحانیت سے ہو، یا معیشت و معاشرت سے، لیکن اپنی ساری بزرگی اور اپنی غیر معمولی اہمیت کے باوجود وہ اپنی ذات کو یا اپنی خلافت کو ہر خطا سے پاک اور منترہ نہیں سمجھتا اور اس وجہ سے وہ بار بار اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ خوب و ناخوب، صحیح اور غلط کا پیمانہ صرف ایک ہی ہے اور وہ باری تعالیٰ اور اُس کے رسول کی اطاعت ہے اس لیے عوام کو اس معیار کے ساتھ اس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس معیار پر پورا اتر رہا ہو تو وہ ان کی اطاعت کا مستحق ہے وگرنہ عوام سے اس کا مطالبہ کرنے میں کسی طرح بھی حق بجانب نہیں۔ اس ضمن میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارِ خلافت سنبھالتے ہوئے جو بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا وہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

۱۔ ابوداؤد۔ کتاب الصلوٰۃ باب الرجل یخطب علی قوم

ایہا الناس فانی قد ولّیتُ

علیکم ولستُ بخیرکم فان احسنُ

فَاعینونی وان اسأتُ فقومونی -

لوگو! میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ پس اگر میں بھلائی کا کام کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر مجھ سے کوئی نغزش سرزد ہو جائے تو مجھے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو۔

عوام کے سامنے اپنی بشریت اور اس کے فطری تقاضوں اور غلطی کے سرزد ہونے کے امکانات

کا اعتراف کرنے کے بعد پھر اُس معیار کا ذکر فرمایا جس کے مطابق انہیں اپنے سربراہوں کے

اعمال کا جائزہ لینا چاہیے۔

جب تک میں اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت

کروں تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ

اور اُس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر

میری کوئی اطاعت فرض نہیں رہتی۔

اطیعونی ما اطعت اللہ و

رسولہ۔ فاذا عصیت اللہ ورسولہ

فلا طاعة لی علیکم۔

مندرجہ بالا گزارشات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام میں اللہ اور

اُس کے رسول کے علاوہ کوئی ہستی اور ادارہ ایسا نہیں جو مکمل طور پر مہصوم ہونے کا دعویٰ

کر سکے اور اس بنا پر اُس کی غیر مشروط اطاعت اور پیروی ہم پر لازم کی گئی ہو۔

اسلام کو اس معاملے میں تمام دوسرے مذاہب پر فوقیت اور امتیاز حاصل ہے۔ یہ عقیدہ

اُسے وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس عطا کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک ہدایت کا سرچشمہ باری

تعالیٰ کی ذات اور اس کا وہ مقدس رسول ہے جس کی وساطت سے اُس نے اس ہدایت کو

نوعِ انسانی تک پہنچایا اور اُس کے عملی مضمرات اُس کی حیاتِ طبیہ سے واضح کیے۔ اس بنا پر

مسلم قوم کی عقیدت و محبت کا مستقل مرکز و محور صرف اللہ اور اس کے رسول ہیں۔ باقی سب



عقیدتیں اس ایک عقیدت کے تابع ہیں۔

دنیا کی دوسری اقوام میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جسے اس معاملے میں مسلمانوں کی ہمہری حاصل ہو۔ اُن کے ہاں ہمیں بے شمار ایسے ادارے ملتے ہیں جنہیں وہ ہر نقص سے پاک سمجھتے ہیں۔ فلسفہ مذہب کے ماہرین نے اس اختلاف کی وجہ بتائی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ اُن کا تجزیہ یہ ہے کہ چونکہ اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس نے حاملِ وحی کی تصریحات اور اس کی توجیہات کو پوری طرح محفوظ رکھا ہو اس لیے الہام ربانی کی فکری اور نظری توضیح اس کے مختلف پہلوؤں کی تشریح اور اُن کی عملی تعبیر کے لیے انہیں بعض شخصیتوں اور اداروں کو عصمت کا وہ مقام دینا پڑا جس پر حقیقت انبیاء علیہم السلام فائز ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ ان بزرگ ہستیوں یا ان مقدس اداروں کی تصریحات ہر خطا سے بالکل پاک اور منزہ نہیں ہو سکتیں اور ان میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے تو پھر خود کلامِ الہی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ احکامِ الہی پر عمل پیرا ہونے کے لیے ان کی عملی وقتوں کو صحیح طور پر چل کرنے کے لیے اور ان کے مختلف گوشوں کی دستاویز اور صراحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود باری تعالیٰ کا رسول اس حکم کے آؤر اُس کی نگرانی میں ان سارے مراحل میں انسان کی رہنمائی کرنے تاکہ اُسے اس امر کا پوری طرح اطمینان ہو کہ وہ منشا الہی کو عین اس کی ہدایت کے مطابق پورا کر رہا ہے۔

جن مذاہب میں لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ یہ منصب دوسرے افراد اور اداروں کو سونپا وہ قطری طور پر اس بات کے لیے مجبور تھے کہ ان افراد اور اداروں کے فیصلوں کو بھی ہر خطا لغزش اور کمزوری سے اسی طرح محفوظ و مامون سمجھیں جس طرح کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں کیونکہ جب تک ایک انسان کے دل و دماغ میں یہ بات پوری طرح پیوست نہیں ہو جاتی کہ وہ تعلیماتِ ربانی کو اسی انداز سے اپنا رہا ہے جس کی باری تعالیٰ نے خود نشاندہی کی ہے اس وقت تک اُسے روحانی تسکین نصیب نہیں ہو سکتی۔ مذہب کی پیروی کسی قانون کی پیروی نہیں جسے انسان بالجمبر کرنے پر مجبور ہو۔ مذہب کا تعلق ظاہری قوانین سے کہیں زیادہ دلی کیفیات سے ہے اس لیے انسان

مذہبی دائرہ میں جو کچھ کرتا ہے وہ برضا و رغبت کرتا ہے، اور اسے بڑے مقدس جذبات اور پاکیزہ احساسات کے ساتھ پائیہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ تعلیمات ربانی کے عملی پہلوؤں کو بھی اتنا ہی پاک، مقدس، ہر خطا اور عیب سے پاک اور منترہ سمجھے جتنا کہ کتاب اللہ کو سمجھتا ہے۔ یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں جب کلام الہی کے سمجھنے اور اسے حیات انسانی کے مختلف شعبوں میں اپنانے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی واضح اور مستند ہدایات حاصل نہ کر سکیں تو انہوں نے دوسری شخصیتوں اور اداروں کے فیصلوں کو منترل من اللہ سمجھ کر انہیں مذہبی عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا۔

تاریخ کے اوراق ان قوموں کے ان غلط فیصلوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بعض افراد نے مشاہدہ باطن کرنے والوں کو نبوت کے مقام پر فائز کر کے ان کی ہر بات کو جوں کا توں قبول کیا، بعض نے حکمرانوں اور طاقتور لوگوں کو کلام الہی کا شارح اور ترجمان سمجھا اور ان کی اس طرح غیر منترہ اطاعت کی جس طرح خدا کا بندہ اللہ اور اس کے رسول کی کرتا ہے۔ بعض نے حکومت اور اس کے سربراہوں کے بارے میں یہ غلط تاثرات قائم کیے کہ ان سے کسی غلطی کا صدور ناممکن ہے۔ مسلمانوں کے ہاں مرکزیت کی عصمت کا جو تصور پیش کیا جا رہا ہے وہ بھی اسی غلط نظر کا پٹا ہے۔ معصومیت کا تاج یوں تو مختلف حالات اور مختلف ادوار میں مختلف طبقوں اور اداروں کے سر پر رکھا جانا رہا ہے لیکن ہم یہاں صرف کلیسا اور ارباب کلیسا کے بارے میں چند چیزیں پیش کرتے ہیں۔

عیسائیوں کے ہاں کلیسا کا پورا نظام اس نبیاد پر قائم ہے کہ روح مقدس (HOLY SPIRIT) کو اپنے اظہار کے لیے پیکر محسوس درکار ہے اور یہ پیکر محسوس صرف کلیسا اور اس کے ارباب ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کلیسا درحقیقت وہ لباس مجاز ہے جس میں روح مقدس جلوہ گر ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب روح ہر عیب سے پاک اور ہر خطا سے منترہ ہے تو جو نظام اس کا منظر ہے وہ بھی لازمی طور پر پاکیزہ اور منترہ ہوگا۔ اس نظام کی جو تشریح

ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION DARWELL STONE ڈارول سٹون نے  
AND ETHICS میں کی ہے وہ قابلِ غور ہے:

نظامِ کلیسا ایسے زندہ افراد سے عبارت ہے جن میں سے ہر فرد روحِ مقدس کا حریم ہے۔ پھر اس نظام کی تقدیسِ زمان و مکان اور افراد سے وابستہ نہیں بلکہ یہ مستقل اور قائم بالذات ہے۔ اہلِ کلیسا کے گناہ ان کی پاکیزگی کو قطعاً متاثر نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد بڑی تفصیل کے ساتھ اس دائرۃ المعارف میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ آخر کلیسا اور اربابِ کلیسا کو معصوم اور منترہ تسلیم کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ بحث اس قدر طویل ہے کہ اسے چند صفحات میں سمیٹا نہیں جاسکتا مگر اس کا اساسی تصور وہی ہے جس کی طرف ہم نے گذشتہ صفحات میں اشارہ کر دیا کہ تعلیماتِ الہی کو جب تک کوئی باطنی برحق عمل کے سانچوں میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتا اس وقت تک اُن کے سارے گوشے پوری طرح بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ تعلیماتِ الہی کی تقدیس برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کی عملی تعبیر کا فرض بھی وہی فرمایا ادارہ سرانجام دے جو عشاءِ الہی کا پوری طرح راز داں ہونے کی وجہ سے اُسے خالق اور مالک کی مرضی کے عین مطابق اور اُس کی رہنمائی میں پوری واضح کر سکتا ہو اور پھر اپنے عمل سے اس کے عملی پہلو بنی نوع انسان کے ذہن نشین کرا سکے۔ اس امر کی وضاحت ایک عیسائی قاضی کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں:-

”کلیسا ایک زندہ ادارہ ہے جو پوری دنیا کی مسیحیت کو ایک سلک میں منسلک کر دیتا ہے اور افراد کے ایمان کی نشوونما کرتا اور اُسے قوت و توانائی فراہم کرتا ہے

لہ تفصیل کے لیے دیکھیے ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS

VOL. III. P. 124

۴۰۵ ایضاً - P. 125.

اسی کے ذریعہ نوع انسانی پر کتاب مقدس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور وہ منعم حقیقی کی رحمتوں اور نوازشوں سے مستفید ہوتی ہے۔ اگر کلیسا بائبل کی تعلیمات کی عملی ترویج کا فرض سرانجام نہ دے تو یہ کتابوں کے صفحات میں ہی بکھری پڑی رہیں اور کوئی انہیں اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش نہ کرے۔ بائبل کی حقیقی افادیت اس وقت سامنے آتی ہے جب کلیسا کا زندہ نظام اس کی تصدیق کرے اور پھر کتاب مقدس کے عملی پہلوؤں کی مستند اور صحیح تعبیر پیش کر کے نوع انسانی کو دنیائے عمل میں انہیں اپنانے کی دعوت دے۔

کلیسا کی عمارت بلاشبہ اینٹ پتھر اور گارے سے تعمیر ہوتی ہے لیکن اس کے نظام کو تو بہر حال انسان ہی چلاتے ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت میں ان سے خطا اور غلطی کا صدور بہر وقت ممکن ہے۔ اب جبکہ کلیسا کے نظام کو بہ اعتبار سے صحیح، برحق اور ہر قسم کی غلطی سے پاک مان لیا گیا تو اس کے بعد اہل کلیسا کی عصمت کو نسیم کرنا بھی نہایت ناگزیر تھا۔ چنانچہ یہی ہوا پہلے نظام کلیسا کو ہر خطا سے پاک اور منزه سمجھا گیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ یہ نظام اسی صورت میں سونپھدی صحیح اور درست رہ سکتا ہے جب باری تعالیٰ خود اس کے چلانے کا انتظام کرے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اس کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری ہے خداوند قدوس خود انہیں ہر قسم کی لغزشوں اور خطاؤں سے محفوظ رکھے۔ اس نظام کے بارے میں جب تک لوگوں کے دلوں میں یہ اطمینان پیدا نہ ہو جاتا کہ وہ نظام رضایہ خداوندی کے عین مطابق چل رہا ہے اور باری تعالیٰ کی نگرانی میں اُس روحانی مقصد کو پورا کر رہا ہے جو تخلیق کائنات کی غایت اولیٰ ہے، اس وقت تک انسان اُس طمانیت قلب سے لذت آشنا نہ ہو سکتا تھا جو ایمان کا نہایت قیمتی بلکہ لازمی جزو ہے۔ عقیدہ مذہب کی جان اور اس کا جوہر حیات ہے یہی چیز

انسان کو مذہب کے روحانی اور اخلاقی نظام کے باہر میں سکون خاطر عطا کرتی ہے جسکی اساس مادی نفع و نقصان کے بجائے ایک آن دکھی ذات کی رضا اور خوشنودی کچھ ہوتی ہے۔ پھر اسی عقیدہ سے اُس کے ہاتھ ایمان و ایتقان کی وہ لازوال دولت ہاتھ آتی ہے جو آنکھوں سے مستور اور حواس سے ماوراء حقائق کے متعلق اُسے اطمینان عطا کرتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز کلیسا کی عمارت سے تو حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لیے عوام کو اُن حضرات کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا جن پر اس نظام کلیسا کو چلانے کی براہ راست ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ عوام نے ان لوگوں کو مقام رستہ پر فائز کر کے اُن کے ساتھ عقیدت و محبت کا وہ رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی جو انسان باری تعالیٰ کے پیغمبر کے ساتھ کرتا ہے۔

مذہبی طبقوں کی معصومیت کا تصور یکا یک پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس انداز پر سوچنا شروع کیا کہ پادری عام حالات میں گناہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں لیکن جب وہ نظام کلیسا کے نمائندے بن کر کوئی بات کریں تو اس میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ جب ایک معصوم ادارے کی نمائندگی کریں گے تو باری تعالیٰ انہیں لازمی طور پر ہر لغزش اور خطا سے محفوظ رکھے گا۔ اس ضمن میں ایک نامور پادری کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں جو اس نے لیڈی سائمن کو ۱۸۶۷ء میں تحریر کیا تھا۔

”مجھے بیلرٹن سے اس معاملے میں پورا پورا اتفاق ہے کہ خواہ پوپ میرا من الخطا ہے یا نہیں لیکن اس کی بلا چون و چرا اطاعت ہم سب پر لازم ہے۔ اس کی نافرمانی سے ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ جن حقائق کی نشاندہی کرتا ہے جس قسم کی بشارتیں دیتا ہے اور جس نوعیت کی تنبیہات کرتا ہے اُن میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس کے انداز فکر میں بھی جانبداری پائی جاسکتی ہے لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ بات مسلم ہے کہ وہ جب کلیسا کے نمائندے

کی حیثیت سے گفتگو کرتا ہے تو اس کی زبان فیض ترجمان سے ہمارے آقا و مولا  
ارشاد فرماتے ہیں:

اسلام اور عیسائیت میں یہ اختلاف بڑے دور رس نتائج کا حامل رہا ہے۔ اس کا  
اثر یہ ہوا کہ عیسائیت اور بعض دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے یا تو مذہبی طبقوں  
کو رسل اور انبیاء کی طرح ہر خطا سے متبرا اور ان کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو ارشادِ ربانی  
سمجھ کر تسلیم کیا یا پھر ان کی باتوں کو سرے سے ہی رد کر دیا اور انہیں تاریک خیالی، تنگ نظری  
تصیب اور جہالت کا پیکر خیال کیا۔ پھر روشن خیالوں اور مذہبی طبقوں کے درمیان ہم نہ  
صرف اختلاف کی ایک وسیع خلیج حاصل دیکھتے ہیں بلکہ ان کے درمیان کشمکش اور سرسبز پھول کا  
بھی ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ پاتے ہیں۔ عیسائیوں کے اندر جب بھی غور و فکر کی تحریک  
پیدا ہوئی تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے مذہبی رہنماؤں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا  
اور ان کے اثرات کو زائل کرنے پر سارا زور صرف کیا۔

اسلام میں علماء اور فقہاء کی حیثیت عیسائیت کے ائمہ سے ہمیشہ مختلف رہی ہے۔  
مسلمانوں نے اپنے علماء کو کبھی مبرا من المخطا نہیں سمجھا۔ اس بنا پر وہ ان کی تصریحات سے  
بڑے خلوص کے ساتھ اختلاف کرتے رہے۔ اور اس وقت تک انہیں تسلیم نہ کیا،  
جب تک کہ انہیں اس امر کا یقین نہیں ہو گیا کہ ان حضرات کی آرا اللہ اور اس کے رسول  
کی سنت سے ماخوذ ہیں اور اسلام کے فراج سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ انہیں جہاں  
کہیں ان میں کوئی خامی نظر آئی، بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس کی نشاندہی کی اور بڑی آزادی  
کے ساتھ اس پر گرفت کی۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان طرزِ فکر کے اس اختلاف نے معاشرتی، معاشی

اور سیاسی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ معاشرتی طور پر مسلمانوں کے اندر کوئی ایسا مذہبی طبقہ پیدا نہ ہو سکا جسے دین کی ابارہ داری حاصل ہو۔ ہر شخص جس نے اسلامی تعلیمات حاصل کیں وہ طبقہ علماء میں شمار ہونے لگا لیکن یہ مرتبہ اور مقام اس کے لیے کوئی خصوصی مراعات کے حصول کا ذریعہ نہ بنا۔ وہ معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ عوام اور علماء اس سے مسائل میں اختلاف کرتے، اس کی گفتگوں پر اُسے ٹوکتے، اس کی علمی تحقیقات میں جہاں کہیں انہیں کمزوری نظر آتی اس کا کھلے بندوں اظہار کرتے اور نہ صرف خود اُسے رد کر دیتے بلکہ دوسروں کو بھی اُسے قبول نہ کرنے کی تلقین کرتے۔

اسلامی معاشرے میں طبقہ علماء کے ساتھ اس مساویانہ سلوک کی وجہ سے جمہوری اقدار کو اتنا کام نصیب ہوا۔ یہاں اگر جمہوریت پامال ہوتی ہے تو اس کی وجہ علماء نہیں بلکہ بادشاہ اور ملوک تھے جنہوں نے اپنے ناجائز تصرف کو قائم رکھنے کے لیے عوام کے بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالا۔ علماء کی جو کچھ قدر و منزلت تھی وہ کچھ اس وجہ سے نہ تھی کہ باری تعالیٰ نے ان کے طبقے کو کوئی خاص امتیازات اور حقوق دے رکھے تھے بلکہ ان کی عزت و توقیر کا سارا دار و مدار عام مسلمانوں کی طرح، ان کی نیکی، پرہیزگاری، خدا خونی، دین سے گہری محبت اور تعلیمات الہی کے صحیح فہم پر تھا۔ اور ان میں سے کوئی خرابی بھی ایسی نہیں جو ان کے ایک خاص طبقے کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں حاصل ہو، بلکہ یہ وہ صفات ہیں جنہیں ہر شخص اپنے اندر پیدا کرنے کا پورا پورا حق و اختیار رکھتا تھا۔

اس تصور کی وجہ سے مسلم معاشرے میں علماء نے دین اور مذہب کے نام پر وہ لوٹ کھسوٹ بھی نہیں کی جس کے بڑے درد انگیز واقعات ہیں دوسرے معاشروں میں ملتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں چونکہ طبقہ علماء معصوم ہونے کی وجہ سے کچھ آسانی حقوق رکھتا تھا اس وجہ سے وہ معاشرے پر جس قسم کا جائز و ناجائز باؤ ڈالنا چاہتا بڑی آسانی کے ساتھ ڈال لیتا۔ اور کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہ ہوتی۔ وہ لوگوں کو مغفرت کے پڑانے

دیتا اور ان کے ہاتھ جنت کے قبائے بیچتا۔ ان پر ہر طرح کے ظالمانہ محصولات عائد کرتا۔ مسلم سوسائٹی اس نوعیت کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ رہی۔ یہاں اگر بعض جاہل اور دنیا پرست گدنی نشینوں نے اس طرح کی مذموم حرکات کیں تو انہیں بر ملا ٹوکا گیا اور علمائے حق نے حق پسند کی پوری تائید کے ساتھ ان کی ان خلافِ دین کارروائیوں پر گرفت کی اور ان کے ان ناجائز ذرائع سے کماتے ہوئے مال کو اکل حرام قرار دیا۔

پھر سیاسی اعتبار سے اگردیکھا جائے تو مسلمانوں کے اندر عدل و مساوات کے جو احساسات و تصورات پائے جاتے ہیں ان کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کام کر رہا ہے کہ معصوم صرف نبی کی ذات ہے، دوسرے ہر بشر سے غلطی کا صدور ممکن ہے۔ حضور سرور کائنات کے بعد جو کوئی اپنی بات منوانا چاہتا ہے وہ اس کے لیے دلائل پیش کرے اور ثابت کرے کہ اُس کی یہ بات اللہ اور رسول کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ کوئی شخص اب اپنی کسی تصریح و توجیہ کو ابہامی یا منکرل من اللہ کہہ کر تسلیم نہیں کروا سکتا۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان اس باب میں کتنا اختلاف موجود ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ عیسائیوں کے ہاں جب جمہوری رجحانات نے زور پکڑا تو انہیں مذہب کو خیر باد کہنا پڑا۔ کیونکہ کسی معاشرے میں جمہوری اقتدار اور حقوق آسمانی رکھنے والے طبقے بیک وقت پنپ نہیں سکتے۔ لیکن مسلمانوں کے ہاں جمہوریت اور دین کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ان کے ذہن اس تصور سے کبھی خالی نہیں ہوئے کہ اب کوئی شخص اپنی بات کو وحی اور ابہام کہہ کر عوام سے بلا چون و چرا اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اُسے اب دوسرے ابنائے جنس کی طرح اپنی بات کو قرآن و سنت کے ترازو میں تول کر پیش کرنا ہوگا اور لوگ اسی کے مطابق اس کا وزن متعین کر کے اُسے رد و قبول کریں گے۔